حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم

بلقان ریاستوں کا سفر

(دوسری اور آخری قسط)

بوسنیا کے علمی شہر موستار میں

بوسنیا کا دارالحکومت سرائیوو (Sarajevo) ہے، اور ہماری منزل وہی تھی۔ بوسنیا ہرزیگونیا ۵۱۱۸۰ کیلومیٹر رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ سرائیوو شہر کافی دور تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ہماری سہولت کا یہ غیبی انتظام فرمایا کہ سرائیوو سے تقریباً دو گھنٹے کی مسافت پہلے ایک تاریخی شہر موستار (Mostar) آتا ہے۔ یہاں دمشق کے پڑھے ہوئے ایک نوجوان عالم شیخ جواد کو میری یہاں آمد کا پتہ چلا، تو انہوں نے امریکہ میں اپنے کسی دوست کو فون کر کے ان سے میرا یا میرے کسی ساتھی کا نمبر لینا چاہا، تو انہوں نے مفتی شبیر صاحب کے صاحبزادے مولانا یوسف شبیر کا نمبر دیدیا جو اس سفر میں ہر وقت میرے ساتھ تھے۔ ان سے بات کر کے انہوں نے کہا کہ سرائیوو سے پہلے ان کا شہر موستار آتا ہے، اور وہ چاہتے ہیں کہ ہمارے قافلے کی وہ مہمانی کریں۔ چنانچہ ہم نے موستار میں ان کے گھر پر قیام کیا، انہوں نے ہم گیارہ افراد کے لئے بہترین کھانے کا انتظام کر رکھا تھا جو مقامی انداز کا کھانا تھا، لیکن سب نے اس کا بہت لطف اٹھایا۔ ان کے ڈرائنگ روم کو دیکھا، تو وہ کتابوں سے بھرا ہوا تھا، اور ان میں میری بھی کئی کتابیں موجود تھیں جن پر انہوں نے میرے دستخط لئے۔ انہوں نے بتایا کہ شہر موستار علماء کا شہر رہا ہے جہاں سے بڑے بڑے علماء اور مصنفین پیدا ہوئے ہیں۔ انہوں نے یہاں کے علماء کی تالیفات کے مخطوطے دکھائے، اور ساتھ ہی یہ لرزہ خیز حقیقت بھی کہ ان مصنفین کے وارث اب مسلمان بھی نہیں رہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ایک اہم مخطوطہ اصول فقہ حنفی پر شیخ مصطفیٰ ایوبی زادہ معروف بہ شیخ یویو کی شرح "المنتخب" کا تھا۔ "المنتخب فی أصول المذهب" درحقیقت اس کتاب کا نام ہے جو ہمارے درس نظامی میں "حسامی" کے نام سے مشہور ہے، اور اپنے مؤلف شیخ حسام الدین محمد بن محمد بن عمر الاخسیکثی رحمہ اللہ تعالیٰ کی مناسبت سے اُسے حسامی کہا جاتا ہے۔ شیخ مصطفیٰ ایوبی رحمۃ اللہ علیہ جو موستار ہی کے باشندے تھے، انہوں نے حسامی کی یہ مبسوط شرح لکھی تھی۔ شیخ جواد نے ایک مطبوعہ کتاب "الجوهر الأسنى فى تراجم علماء وشعراء بوسنه" بھی دکھائی جس میں بوسنیا کے علماء کے حالات ذکر کئے گئے ہیں۔ شیخ جواد خود بھی نہایت علم دوست اور وسیع المطالعہ نوجوان ہیں، اور ہمارے

ساتھ رہنے کے دوران مسلسل علمی سوالات کرتے رہے۔انہوں نے میرے قیلولہ کے لئے ایک کمرہ تیار کرر کھا تھا جہاں کچھ آرام کرنے کے بعد وہ شہر موستار دکھانے لے گئے۔اس شہر میں پچاس فی صد آبادی مسلمانوں کی اور پچاس فی صد سرب عیسائیوں کی ہے۔شہر میں پندرہ مسجدیں ہیں،اور یہاں بھی مسلمانوں کو قید و بند اور خونریزی کا نشانہ بنایا گیا تھا۔شیخ جواد نے بتایا کہ ان کے والد کو قید کیا گیا،۔اور ان کے چچازاد بھائی شہید ہوئے۔

یہ شہر دریائے نیرتیوا(Neretva River) کے دونوں طرف آباد ہے۔یہاں پہاڑ کی بلندی پر ایک پرانا پُل ہے جو اس دریا پر بنا ہوا ہے،اور سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز ہے۔اس پُل سے دریا ایک آبشار کی صورت میں گرتا نظر آتا ہے۔یہیں سے سیڑھیاں کوسکی محمد پاشا(Koski Mehmed-Pasha) مسجد تک پہنچاتی ہیں،جس کے میناروں سے شہر کا طائرانہ منظر نظر آتا ہے۔ موستار کے مضافات میں ایک قدیم خانقاہ بھی ہے جو درویش خانقاہ کہلاتی ہے۔خلاصہ یہ کہ اس علماء اور اولیاء کے شہر میں آج ہم دین کے نام لیوا،بطور خاص اپنے لباس میں،بالکل اجنبی محسوس ہوتے تھے،عزیزم مولانا یوسف نے کہا کہ بعض جگہ سیاح ہمیں اس طرح دیکھتے ہیں جیسے ہم بھی سیاحوں کی دلچسپی کی چیز(tourist attraction) ہوں۔

مغرب یہاں تقریباً دس بجے ہورہی تھی،ہم نے ایک ایسی مسجد میں نماز ادا کی جو 498 سال پہلے سلطان سلیمان کی بنائی ہوئی تھی۔مغرب کے بعد شیخ جواد نے تمام ساتھیوں کے لئے عشائیہ کا انتظام کیا۔اور ان کا اصرار تھا کہ ہم رات میں انہی کے یہاں قیام کریں،اور صبح کو سرائیو روانہ ہوں۔اگرچہ سرائیو یہاں سے دوڈھائی گھنٹے کی مسافت پر تھا،اور طویل سفر کے بعد یہ مزید سفر شاق معلوم ہورہا تھا،لیکن رائے یہی بنی کہ یہ مشقت اسی وقت اٹھالی جائے،تاکہ سرائیو پہنچ کر اطمینان ہو کہ اب سڑک کا کوئی اور سفر نہیں ہے۔چنانچہ ہم شیخ جواد سے معذرت کر کے روانہ ہوگئے۔رات کے وقت سڑک بالکل صاف تھی،اس لئے بفضلہٖ تعالیٰ ہم دو گھنٹے میں سرائیو کے ہوٹل میں پہنچ گئے۔اس وقت رات کے تقریباً دو بج رہے تھے۔ان علاقوں میں یہ ایام ایسے تھے کہ جن میں یہاں رات کو شفق غروب نہیں ہوتی،اس لئے نماز فجر اس وقت پڑھی جاسکتی تھی۔چنانچہ نماز فجر ادا کر کے ہم سوگئے،اور دل مطمئن ہوگیا کہ اب چار دن تک سڑک کا کوئی لمبا سفر نہیں ہے۔

بوسنیا کی مختصر تاریخ

آگے بڑھنے سے پہلے بوسنیا کا مختصر تعارف کرادینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔بوسنیا یورپ کے جنوب مشرق میں جزیرہ نمائے بلقان کی ایک انتہائی سرسبز و شاداب ریاست ہے۔خلافت عثمانیہ کے دور میں یہ علماء،فقہاء اور

ادباء کا ایک اہم مرکز تھی۔ یہاں خلافت عثمانیہ کی حکومت ۱۴۶۳ء میں قائم ہوئی، اور چار سو سال تک شان وشوکت اور خوشحالی کے ساتھ جاری رہی۔ جب خلافت عثمانیہ کمزور پڑنی شروع ہوئی، تو یورپ کی بڑی طاقتوں، خاص طور پر برطانیہ، فرانس اور آسٹریا کی نگاہیں اس خطے پر مرکوز تھیں۔ یہاں بار بار یہ آوازیں اٹھائی جاتیں کہ یہاں کی عیسائی آبادی کو اس کے حقوق نہیں دیئے جارہے۔ اس بہانے کو تقویت دینے کے لئے بعض اوقات ایسے انتہا پسندوں کو بھی تیار کیا گیا جو واقعۃً عیسائیوں کے خلاف پُرتشدد کارروائیاں کرتے، اور مذکورہ بالا یوروپی حکومتیں خلافت عثمانیہ کے پاس شکایتیں لیکر پہنچ جاتیں، اور اسے مجبور کرتیں کہ بلقان کی ان ریاستوں کو زیادہ سے زیادہ خودمختاری دی جائے۔ اس سازش کی پوری تفصیلات شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی خودنوشت سوانح حیات "نقش حیات" میں بیان فرمائی ہیں۔ خلافت عثمانیہ چونکہ اس وقت کمزور پڑ چکی تھی، اس لئے وہ رفتہ رفتہ انہیں خودمختاری دینے پر مجبور ہوئی، اور اگرچہ اب بھی انہیں خلافت عثمانیہ کے ایک اہم صوبے کی حیثیت حاصل تھی، لیکن اس پر مرکز کی گرفت ڈھیلی پڑتی گئی، اور آخرکار ۱۸۷۸ء میں معاہدۂ برلن کے نتیجے میں یہ علاقہ آسٹریا۔ ہنگری کے کنٹرول میں آ گیا۔ اس حکومت کے خلاف سرب عیسائیوں نے ایک خفیہ مہم شروع کی، جس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ جب آسٹریا کے ایک ولی عہد آرچ ڈیوک فرینز فرڈی ننڈ نے بوسنیا کے شہر سرائیوو کا دورہ کیا، تو ۲۸/ جون ۱۹۱۴ء کو سرب عیسائیوں کے اس گروپ نے اُسے اور اس کی بیوی کو قتل کر دیا۔ یہ قتل ہی پہلی جنگ عظیم کا نقطۂ آغاز بنا اور آسٹریا۔ ہنگری نے سلطنت سربیا کو جنگ کا الٹی میٹم دیدیا، اور بڑی بڑی طاقتیں اس جنگ میں شریک ہوگئیں جس کی وجہ سے جنگ عظیم جولائی ۱۹۱۴ء سے لیکر ۱۱/ نومبر ۱۹۱۸ء تک جاری رہی، اور اس کے نتیجے میں بوسنیا سلطنت سربیا کے تحت آ گیا، جس کا نام بعد میں یوگوسلاویہ رکھدیا گیا۔ ۱۹۲۹ء میں سلطنت یوگوسلاویہ قائم ہوگئی، اور بلقان کی تمام ریاستیں اس کے زیرنگیں آ گئیں۔ اس زمانے میں بھی علاقے کے لوگوں، بالخصوص مسلمانوں پر جبر وتشدد کا بدترین دور گذرا۔ دوسری جنگ عظیم میں ہٹلر نے حملہ کر کے ۱۹۴۱ء میں یوگوسلاویہ پر قبضہ کرلیا۔ یہ قبضہ ۱۹۴۵ء تک جاری رہا، اور ہٹلر کی شکست کے بعد یہاں کمیونسٹوں نے "سوشلسٹ ری پبلک آف یوگوسلاویہ" کے نام سے اپنی حکومت قائم کرلی۔ کمیونزم کا یہ دور ۱۹۴۵ء سے ۱۹۹۲ء تک جاری رہا۔ اس دور میں کمیونسٹوں نے مذہب کو فنا کرنے کے لئے مسلمانوں اور عیسائیوں دونوں پر بدترین مظالم ڈھائے۔ مسجدوں پر پابندی عائد کی گئی۔ دینی تعلیم ممنوع قرار پائی۔ دینی کتابیں گھروں میں رکھنے پر بدترین سزائیں جاری کی گئیں۔ البتہ یہاں کا حال البانیہ سے اس لئے بہتر تھا کہ یہاں تمام مسجدیں شہید نہیں کی گئیں، اور

دکھانے کے لئے کچھ دینی ادارے بھی برقرار رہنے دیئے گئے۔

۱۹۹۰ء تک کمیونسٹ یوگوسلاویہ کی حکومت جاری رہی، اور جب کمیونسٹ ریاستیں ناکام ہوکر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئیں، تو یوگوسلاویہ کی ریاستیں بھی خودمختار بننے لگیں۔ بوسنیا میں اکثریت مسلمانوں کی تھی، اور اسے آزاد ریاست قرار دینے میں بہت سی رکاوٹیں ڈالی گئیں۔ آخرکار بوسنیا کے سربراہ علیجا عزت بیگ نے اس کی آزادی کا اعلان کردیا۔ سربیا اور کروشیا وغیرہ نے اس کی مخالفت میں سابق یوگوسلاویہ کی فوج کے ساتھ مل کر بوسنیا کے دارالحکومت سرائیوو پر حملہ کردیا۔ ایک طرف حملہ آور سربوں کے پاس اسلحہ کا بڑا ذخیرہ تھا، اور بوسنیا کے مسلمانوں کے پاس ساز وسامان کی کمی تھی۔ اس غیر متوازن صورت حال میں بوسنیا پر ایک مصیبت اقوام متحدہ نے یہ ڈال دی کہ اس علاقے میں اسلحہ کی سپلائی پر مکمل پابندی عائد کردی۔ اس پابندی کے بارے میں بوسنیا کے ایک لیڈر حارث سلیازک (Haris Silajdzic) نے یہ جملہ کہا تھا کہ:

"اس پابندی نے صرف مظلوم کو سزا دی، اور جارحیت کے اس مرتکب کی حمایت کی جس کے پاس اتنا اسلحہ تھا جسے وہ سنبھال بھی نہیں سکتا تھا۔"

اس مشکل صورت حال میں بوسنیا کے مسلمانوں نے بڑے صبر واستقامت کے ساتھ یہ جنگ لڑی، اور اس جنگ میں بوسنیا کے مسلمانوں کی مدد کے لئے بہت سے مسلم ممالک کے رضا کار مجاہدین اطراف عالم سے وہاں پہنچ گئے۔ ان میں مشرق اوسط، شمالی افریقہ، افغانستان، پاکستان، ترکی، اسپین، جرمنی وغیرہ کے مسلمان شامل تھے، جو شروع میں امدادی کارروائیوں کے لئے وہاں رہے، اور بعد میں انہوں نے بوسنیا کی فوج کے ساتھ شانہ بشانہ جنگ میں حصہ لیا۔ اس تین سالہ جنگ کے دوران بوسنیا کے سربراہ عزت بیگ کو امن کی کئی تجویزیں پیش کی گئیں جن میں سے ایک تجویز یہ تھی کہ بوسنیا کو تقسیم کرکے مسلمانوں کے دو علاقوں کے بیچ میں ایک غیر مسلم حکومت قائم کی جائے۔ اس تجویز کو مسترد کرتے ہوئے عزت بیگ مرحوم کا یہ جملہ تاریخ کا حصہ بن گیا ہے کہ:

We choose the certainty of war over the uncertainty of peace, and we will fight.

یعنی: "ہم غیر یقینی امن کے مقابلے میں جنگ کی یقینی حالت کو اختیار کرتے ہیں، ہم لڑتے رہیں گے"

اور آخرکار بوسنیا ہرزگوینا کے نام سے ایک آزاد ریاست وجود میں آگئی۔ جب یہ لڑائی جاری تھی تو الحمدللہ پاکستان اور اس کے عوام کی طرف سے اس میں بوسنیا کے مسلمانوں کے لئے ممکنہ امداد بھیجی گئی تھی، جس کا ذکر آگے ان شاء

اللہ تعالیٰ آئے گا۔لیکن سچی بات یہ ہے کہ اس جنگ کی تفصیلات اور اس کی نوعیت اب اس دورے میں سمجھ میں آئی۔

سرائیوو کا دورہ

سرائیوو پہنچنے کے بعد حضرت مفتی احمد خان پوری صاحب مدظلہم اور ان کے دو ساتھیوں کے علاوہ جو علی الصبح یہاں سے ہندوستان روانہ ہوگئے، اب ہمارے قافلے کے دوسرے تمام ارکان یکجا ہو چکے تھے۔اس دورے کے محرک مولانا محمد حنیف صاحب نے آج کے دن (منگل ۲۶/ جون ۲۰۱۸ء کو) یہ پروگرام بنایا ہوا تھا کہ سرائیوو شہر کا دورہ کیا جائے جس میں بعض ملاقاتیں بھی شامل تھیں۔سرائیوو (Sarajevo) بوسنیا ہرزگونیا کا دارالحکومت ہے جس کے درمیان دریائے ملجیکا (Miljeca) بہتا ہے۔اور تین طرف سے الپ کے فلک بوس پہاڑ اسے گھیرے ہوئے ہیں۔سربوں کی فوجیں ان پہاڑوں پر قابض تھیں، اور پورا شہر ان کے نشانے پر تھا جہاں سے وہ مسلسل شہر پر گولہ باری اور فائرنگ کا سلسلہ جاری کئے ہوئے تھے۔شہر کی بہت سی عمارتیں اور بیشمار انسان اس گولہ باری کی نذر ہوئے۔دوسری طرف بوسنیا کے مسلمانوں کی فوج کم بھی تھی، اور ان کے پاس اسلحہ بھی بہت تھوڑا تھا۔اس اسلحہ کے ذریعے پہاڑوں پر بیٹھی ہوئی فوج کا مقابلہ کرنا انتہائی مشکل تھا۔دوسری طرف ان کو باہر سے اسلحہ ہی نہیں، کھانے پینے کی چیزوں کی سپلائی بھی اس لئے بند تھی کہ سپلائی کے راستوں پر یا تو دشمن کا قبضہ تھا، یا اقوام متحدہ کی فوجیں حائل تھیں۔یہاں آکر ہی صحیح اندازہ ہوتا ہے کہ جنگ کے دوران بوسنیا کے مسلمان کن صبر آزما حالات سے گذرے ہیں۔

ہم سب سے پہلے شہر کی قدیم ترین مسجد میں گئے جو سلطان محمد فاتح ثانی نے ۱۴۶۲ء میں بنائی تھی، اور اب "شاہی مسجد (Emperors Mosque) " کہلاتی ہے۔یہاں شیخ صدرالدین نے ہمارا استقبال کیا جو اس مسجد کے امام اور اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد کے فارغ التحصیل ہیں۔انہوں نے ہمیں بوسنیا کی جنگ کی تفصیلات بتائیں، اور ساتھ ہی یہ کہا کہ اگرچہ اس جنگ میں تقریباً دو لاکھ مسلمان شہید ہوئے، لیکن آخر کار یہ جنگ اس لحاظ سے مسلمانوں کے لئے ایک رحمت ثابت ہوئی کہ مسلمانوں پر دین کی جو گرفت پچھلے دور میں کمزور پڑ چکی تھی، اس جنگ نے ان کے اندر ایک نئی روح پھونک دی، اور اب رفتہ رفتہ یہاں کے دینی حالات بہت بہتر ہو رہے ہیں۔

سرائیوو کے قدیم شہر میں ایک یونی ورسٹی ہے جس میں اسلامی علوم کا ایک مضبوط شعبہ ہے۔اس کے سربراہ پروفیسر احمد ہیں جنہوں نے میری انگریزی کتاب "انٹروڈکشن ٹو اسلامک فائنانس " کا بوسنیا کی زبان میں ترجمہ شائع کیا ہے۔انہوں نے دعوت دی تھی کہ ہم ان کی یونی ورسٹی کا دورہ کریں، چنانچہ اس یونی ورسٹی میں انہوں نے

ہمارا بڑی محبت سے استقبال کیا، اور میری کتاب کے بوسنین ترجمے کے متعدد نسخے ہمیں تحفے میں دیئے، اور کہا کہ الحمدللہ یہ کتاب یہاں کافی مقبول ہوئی ہے۔ پھر انہوں نے بتایا کہ صرف پرانے شہر میں اسّی مساجد ہیں جو خلافت عثمانیہ کے وقت سے چلی آتی ہیں۔ اسلامی علوم کا یہ شعبہ ۱۸۸۴ء میں قائم ہوا تھا جب یہاں آسٹریا کی حکومت تھی، اور اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ یہاں مسلمانوں کے مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لئے قاضیوں کی تربیت کی جائے۔ یہ تربیت ۱۹۴۵ء تک جاری رہی، اور یہاں سے نکلنے والے قاضی شرعی عدالتوں میں شرعی فیصلے کرتے رہے۔ لیکن ۱۹۴۶ء سے ۱۹۷۱ء تک کمیونسٹ دور میں اس کو بند کردیا گیا تھا۔ ۱۹۷۱ء میں دین پر پابندیوں میں کچھ کمی آئی، جس کے بعد اس فیکلٹی نے دوبارہ کام کرنا شروع کیا۔ اب اس کے تحت چھ مدرسے چل رہے ہیں جن میں دو ہزار طلبہ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ان میں سے ۱۵۰۰ حضرات مساجد میں امام مقرر ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ہماری فیکلٹی اب یونی ورسٹی آف سرائیوو کا ایک حصہ ہے، اور الحمدللہ اب یہاں کے حالات بہت بہتر ہیں۔ ملک میں تمام دینی کام ایک تنظیم کے تحت انجام پاتے ہیں جو مشیخۃ کہلاتی ہے، اور مختلف مقامات پر مفتیوں کا تقرر بھی یہی تنظیم کرتی ہے۔ پروفیسر احمد نے کہا کہ بوسنیا کی زبان میں دینی کتابوں کی کمی ہے، اور ہم سے مشورہ کیا کہ مزید کن کتابوں کا ترجمہ یہاں کے لئے مفید ہوگا؟ میں نے انہیں چند کتابوں کے نام بتائے، اور انہوں نے شروع میں میری کتاب "آسان نیکیاں" کا ترجمہ شائع کرنے کا ارادہ ظاہر فرمایا۔

یونی ورسٹی سے نکلنے کے بعد ہم نے نماز مغرب یہاں کی ایک اور قدیم مسجد غازی خسرو بیگ میں ادا کی جو ۱۵۳۱ء میں تعمیر ہوئی تھی۔ غازی خسرو بیگ خلافت عثمانیہ کی طرف سے یہاں گورنر بن کر آئے تھے، اور انہوں نے یہاں ایک عالی شان مسجد، مدرسہ، کتب خانہ اور مہمان خانہ قائم کیا تھا۔ اس مسجد کے اطراف میں پرانے طرز کا ایک بارونق بازار ہے جس میں پچاسوں دوکانیں ہیں۔ یہ ساری دوکانیں غازی خسرو بیگ رحمۃ اللہ علیہ نے وقف کرکے ان کے کرائے کی آمدنی اسلامی مقاصد کے لئے مختص کردی تھی۔ کمیونسٹ دور میں یہ سلسلہ ختم کردیا گیا تھا، اب ایک قانون کے ذریعے ان اوقاف کو بحال کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔

بوسنیا کی جنگ کے دوران اس عالی شان مسجد پر مختلف اوقات میں تقریباً سو گولے داغے گئے جس سے مسجد کو بہت نقصان پہنچا تھا۔ ۲۰۰۰ء میں اس کی بڑے پیمانے پر مرمت اور بحالی کا کام ہوا جس کے نتیجے میں اب وہ اپنے پرانے شکوہ کے ساتھ نمایاں نظر آتی ہے۔ غازی خسرو بیگ رحمہ اللہ تعالیٰ کا مزار بھی مسجد کے متصل واقع ہے۔ ہم نے اس عظیم مجاہد کی قبر پر سلام عرض کیا، اور ان کے لئے ایصال ثواب کیا۔

اگلے دن مولانا حنیف صاحب نے یہ پروگرام بنایا تھا کہ ہم سب بوسنیا کے ایک قصبے سرے برینکا (Srebrenica) جائیں، یہ قصبہ اس لحاظ سے ایک منفرد قصبہ ہے کہ اس میں بوسنیا کی جنگ کے دوران آٹھ ہزار مسلمانوں کا اس بری طرح قتل عام ہوا تھا کہ وہاں اب تمام تر بیواؤں اور یتیموں کی آبادی ہے۔ یہاں کے دورے کا مقصد ان کی ضروریات جاننا اور ان کو مدد پہنچانا تھا۔ لیکن لوگوں نے بتایا کہ یہ قصبہ یہاں سے کم از کم چار گھنٹے کی مسافت پر ہے، اور سڑک بھی خراب ہے۔ میں پہلے ہی لمبے سفر سے بہت تھکا ہوا تھا، اس لئے رفقاء نے مشورہ دیا کہ میں وہاں نہ جاؤں، اور جو حضرات جارہے ہیں، انہی سے وہاں کے حالات معلوم ہو جائیں گے، اور انہی کے ذریعے کچھ امدادی رقم بھی بھیجی جاسکے گی۔ چنانچہ میں اور میرے وہ رفقاء جو مقدونیہ سے میرے ساتھ تھے، وہاں خود نہیں گئے، اور مولانا حنیف صاحب کی قیادت میں ایک بس وہاں کے لئے روانہ ہوگئی۔ جو حضرات وہاں گئے، انہوں نے رات کو واپس آکر بڑے دردناک حالات بیان کئے۔ ان کی ملاقات ایک ایسے نوجوان سے ہوئی جو اس قتل عام کے زمانے میں کسی طرح پہاڑوں پر جا بسا تھا، اور دو مہینے اس نے پہاڑوں پر اُگے ہوئے پودوں پر گذارا کیا۔ وہاں کی آبادی کے بیشتر مرد سربوں کی اس سفاکی کا شکار ہوئے جسے اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل نے تاریخ کا بدترین قتل عام قرار دیا تھا۔ وہاں چونکہ بڑی تعداد بیواؤں اور یتیموں کی ہے، اس لئے مولانا حنیف صاحب اور ان کے رفقاء نے وہاں منظم امداد فراہم کرنے کے لئے کچھ مقامی حضرات کو اعتماد میں لیا، اور ان سے مستقل رابطہ رکھنے کا انتظام کیا۔

امید کی سرنگ

جب یہ حضرات سرے برینکا (Srebrenica) روانہ ہوگئے، تو ہم اور ہمارے رفقاء بوسنیا کی جنگ میں مسلمانوں کا ایک عجوبۂ روزگار کارنامہ دیکھنے کے لئے گئے۔ یہ ایک سرنگ ہے جسے اب "امید کی سرنگ (Tunnel of Hope)" کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کرچکا ہوں، سرائیوو شہر اونچے اونچے پہاڑوں میں گھرا ہوا ہے جن پر سرب فوج قابض ہوکر مسلسل گولہ باری کررہی تھی۔ دوسری طرف ائیر پورٹ پر اقوام متحدہ کی فوج تعینات تھی جس نے اس علاقے میں اسلحہ کی سپلائی پر وہ پابندی لگائی ہوئی تھی جس کا ذکر پہلے گذر چکا ہے۔ لہٰذا سرائیوو میں اسلحہ تو درکنار، کھانے پینے کی چیزیں بھی باہر سے آنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ لوگ فاقہ کشی کا شکار تھے، ہسپتالوں میں دوائیں اور علاج کے آلات ختم ہوچکے تھے۔ مجھے ایک بوڑھے بزرگ نے بتایا کہ ایک مرتبہ جنگ کے دوران میری ٹانگ میں گولی لگی جس سے خون بری طرح بہ رہا تھا، میں ہسپتال پہنچا، تو

وہاں متعلقہ آلات نہیں تھے جن سے علاج کیا جاتا۔ میں نے ان سے کہا کہ اس جگہ عام قسم کی پٹی باندھ دو، پھر میں وہ پٹی بندھوا کر پھر جنگ میں شریک ہوگیا۔

ان مشکل حالات میں بوسنیا کے مسلمانوں نے سپلائی بحال کرنے کے لئے ایک خفیہ سرنگ کھودی جو آٹھ سو میٹر لمبی، ایک میٹر چوڑی اور ایک اعشاریہ چھ میٹر اونچی تھی، اور ایسے علاقے میں نکلتی تھی جہاں سے سپلائی ممکن تھی۔ اس سرنگ کا کچھ حصہ یادگار کے طور پر اب بھی محفوظ رکھا گیا ہے جس میں ہم نے داخل ہوکر دیکھا، تو یہ اتنی تنگ سرنگ ہے کہ اس میں انسان جھک جھک کر چل سکتا ہے۔ پوری قوم اس سرنگ کے کھودنے میں شریک تھی، اور بہت سے مرد اور خواتین ہمیں وہ ملے جو اس کی کھدائی میں شریک تھے۔ یہ سرنگ چار مہینے (مارچ تا جون ۱۹۹۳ء) میں مکمل ہوئی جس کے نتیجے میں سپلائی بھی بحال ہوئی، اور اس راستے سے افرادی قوت بھی مہیا ہوئی۔ یہاں کے تمام لوگوں کو ہم نے پاکستان کا شکر گذار پایا، ان کا کہنا تھا کہ ان صبر آزما حالات میں ہمیں سب سے بڑی مدد پاکستان سے ملی جس نے ہمیں اسلحہ اور دوسری ضروریات فراہم کیں۔ ہمارے گائیڈ ہارون ہوجا، جو سرنگ کی کھدائی میں شریک تھے، انہوں نے ہمیں بتایا کہ سربوں نے سرائیوو کا محاصرہ تین سال جاری رکھا، اور اس دوران روزانہ کی بنیاد پر تقریباً تین سو گولے شہر پر برسائے جاتے تھے۔ شہر کی کوئی کھڑکی ایسی نہ تھی جو سلامت رہی ہو۔ ساڑھے گیارہ ہزار افراد اس جنگ میں شہید ہوئے، اور تقریباً چھپن ہزار افراد زخمی ہوئے۔ لیکن اس سرنگ کے ذریعے ہم نے اسلحہ اور گولہ بارود ہی نہیں، گیس اور بجلی فراہم کرنے کا بھی انتظام کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ سرنگ بوسنیا کے مسلمانوں کے صبر واستقلال، ہمت وشجاعت اور پامردی کا ایک شاہکار ہے جس کی نظیر کہیں اور ملنا مشکل ہے۔

یہاں سے ہم سرائیوو شہر کے باہر پہاڑوں اور جھیلوں کا ایک ایسا منظر دیکھنے گئے جو قدرتی نظاروں میں اپنی مثال آپ ہے۔ اگمان نامی پہاڑ کے دامن میں پانچ جھیلیں الگ الگ نکل رہی ہیں جو کہیں ملتی اور کہیں جدا ہوجاتی ہیں، اور ان کے درمیان چھوٹے چھوٹے آبشار گرتے نظر آتے ہیں۔ اس علاقے کو ایک وسیع وعریض پارک کی شکل دیدی گئی ہے جس میں ہر قدم پر ایک نیا منظر دعوت نظارہ دیتا ہے۔

بوسنیا چونکہ سالہا سال علم وفضل کا مرکز رہا ہے، اس لئے یہاں ایک نہایت قیمتی کتب خانہ مشہور ہے جس میں مطبوعات اور مخطوطات کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ مذکورہ بالا پارک کی سیر کے بعد ہم اس کتب خانے میں پہنچے جو غازی خسرو بیگ لائبریری کے نام سے موسوم ہے۔ لائبریری کے سربراہ ڈاکٹر مصطفیٰ نے ہمیں بتایا کہ اس میں

عربی، فارسی، ترکی اور بوسنین زبان کے دس ہزار مخطوطات موجود ہیں، اور کل کتابوں کی تعداد بیس ہزار ہے۔ اس کتب خانے کی فہرست اٹھارہ جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں بہت سی کتابیں ایسی ہیں جو بروکلمان کی فہرستوں میں بھی موجود نہیں ہیں۔ انہوں نے اس فہرست کی سی ڈی ہمیں دی، اور کہا کہ ان میں سے جس مخطوطے کو آپ چاہیں، ای میل کے ذریعے منگوا سکتے ہیں، کیونکہ تمام مخطوطات کو اسکین کرلیا گیا ہے۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ جنگ کے دوران ان کتابوں کی حفاظت ہمارا سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ ہم نے تمام کتابوں اور مخطوطات کو کیلے کے چھلکوں میں چھپا کر صندوق بنالئے تھے، اور جنگ کے دوران آٹھ مختلف جگہوں پر انہیں زمین دوز تہ خانوں میں منتقل کرتے رہے۔ اگرچہ سٹی ہال کے کتب خانے میں تقریباً بیس لاکھ کتابیں جل گئیں، لیکن غازی خسرو بیگ لائبریری کی کتابیں اس طرح محفوظ رہ گئیں۔

مغرب کی نماز ہم نے شاہ فہد مسجد میں ادا کی جو سعودی عرب نے ۲۰۰۰ء میں تعمیر کرائی ہے، اور اس وقت سرائیوو کی سب سے بڑی مسجد ہے۔

ہم واپس ہوٹل پہنچے تو وہاں بوسنیا کے ایک معروف اسکالر ڈاکٹر صفوت ہمارے منتظر تھے۔ یہ ازہر کے فارغ التحصیل ہیں، اور متعدد کتابوں کے مصنف، اور اس علاقے میں **الاتحادالعالمی لعلماء المسلمین** کے سربراہ ہیں۔ انہوں نے کہا کہ بوسنیا کو سلطان محمد فاتح نے استنبول کی فتح کے صرف آٹھ سال بعد فتح کیا تھا، اور یہاں صدیوں علم وفضل کا چرچا رہا، اور ۱۹۹۲ء کی جنگ اس علاقے میں اسلام کی بقاء کی جنگ تھی جس کے نتیجے میں الحمدللہ تعالیٰ یہاں سے اسلام اور مسلمانوں کو فنا کرنے کا منصوبہ ناکام ہوا۔ انہوں نے بتایا کہ آزادی کے بعد ہمیں یہاں دو بڑے مسئلوں کا سامنا ہے، ایک تو برطانوی سفارت خانے کی مدد سے یہاں قادیانیوں نے اپنی تبلیغ کا کام شروع کیا ہوا ہے، اور جو مسلمان ان کی حقیقت سے ناواقف ہیں، وہ انہیں بے ضرر سمجھ کر ان کے ساتھ لگ رہے ہیں۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ یہاں کے مسلمان سالہا سال سے حنفی مذہب کے پیرو ہیں۔ اس وقت سب سے بڑا مسئلہ نوجوانوں کو دین کی بنیادوں سے باخبر کرنا ہے، لیکن کچھ لوگ سلفیت کے نام پر یہاں ایسی بحثیں شروع کردیتے ہیں جنہوں نے نوجوانوں کو سخت ذہنی کشمکش کا شکار بنایا ہوا ہے۔

اگلے دن صبح ہم پہلے بوسنیا کے قومی عجائب گھر (میوزیم) دیکھنے گئے جو ۱۹۱۴ء میں قائم ہوا تھا، اور اس میں پتھر کے زمانے سے لیکر خلافت عثمانیہ کے اختتام تک کی یادگاریں جمع ہیں۔ اس میوزیم کے معائنے میں ہماری رہنمائی دو صاحبان نے کی۔ ایک جناب سیاد جو بوسنیا کے باشندے ہیں، اور انہوں نے برطانیہ میں تعلیم حاصل کی

ہے، اور دوسرے ایک قومی ہیرو جناب فُواد جو بوسنیا کے صدر جناب علیجا عزت بیگ مرحوم کے دوست رہے ہیں، اور جنہوں نے بڑی بہادری اور جاں نثاری کے ساتھ بوسنیا کی جنگ میں خود حصہ لیا تھا۔ انہوں نے بار بار ذکر کیا کہ پاکستان اور اس کے عوام نے اس جنگ میں ہماری کتنی مدد کی۔ خلافت عثمانیہ کے دور کی زندگی اور ثقافت کے مظاہرے کے لئے کئی ہال مخصوص ہیں جن میں دکھایا گیا ہے کہ خلافت کے دور میں کونسی شاندار ایجادات ہوئیں، ان کا طرز معاشرت کیسا تھا۔ خواتین کس طرح پردے میں رہتی تھیں، اور شادی بیاہ کے طور طریقے کیا تھے۔

اسی دن ظہر کے بعد ہمیں بوسنیا کے سابق مفتیٔ اعظم جناب مصطفیٰ سیرک نے اپنے گھر پر دعوت دی تھی، چنانچہ ہم ان کے مکان پر پہنچے، اور انہوں نے مجھے یاد دلایا کہ مختلف مقامات پر ان سے میری ملاقات ہوتی رہی ہے۔ ان کے ساتھ کافی دیر تک مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی، اور انہوں نے پہلی بار یہ انکشاف کیا کہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب مرحوم جو ایوب خان صاحب کے دور میں پاکستان کے ادارۂ تحقیقات اسلامی کے ڈائرکٹر تھے، اور ان کے تحریف آمیز نظریات کی بنا پر علماء پاکستان نے ان کی مخالفت کی، اور ان کے خلاف مہم چلائی، انہوں نے اپنی عمر کے آخری دور میں اپنے ان نظریات سے رجوع کر لیا تھا۔ خدا کرے کہ یہ بات صحیح ہو۔

میرے بوسنیا آنے کی خبر معلوم کر کے سرائیوو کے مختلف اداروں کی طرف سے دعوتیں ملی تھیں کہ میں اپنے رفقاء کے ساتھ ان کے یہاں جاؤں، لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے سب کی دعوت قبول کرنا مشکل تھا، اس لئے مولانا حنیف صاحب نے آج مغرب کے بعد ایک عمومی اجتماع ہمارے ہوٹل ہی میں رکھ لیا تھا، تاکہ ان سب سے یکجا ملاقات بھی ہو جائے۔ چنانچہ مغرب کے بعد یہ اجتماع ہوا جس میں بوسنیا اور سربیا کے محرزین نے بڑی تعداد میں شرکت کی جس میں مساجد کے ائمہ، تاجر حضرات، سرکاری اداروں کے نمائندے اور یونی ورسٹی کے طلبہ اور اساتذہ شامل تھے۔ بعض حضرات سربیا سے پانچ گھنٹے کا سفر طے کر کے یہاں پہنچے تھے۔

اس کانفرنس میں تلاوت کلام پاک کے بعد مولانا حنیف صاحب نے اپنی تنظیم مسلم ویلفیر انسٹی ٹیوٹ کا تعارف کراتے ہوئے انگریزی میں بڑی اثر انگیز تقریر کی، اور بتایا کہ کس طرح انہیں بلقان کی ریاستوں میں کام کرنے کا داعیہ پیدا ہوا، اور بوسنیا کے مہاجرین کس حالت میں بلیک برن آئے تھے، اور صدر بوسنیا جناب علیجا عزت بیگ صاحب مرحوم سے ان کی کس طرح ملاقات ہوئی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ ان کی تنظیم نے پہلے البانیہ میں کام کا آغاز کیا، پھر اسے مقدونیہ تک وسیع کیا گیا، اور اب ہم اس کام کو بوسنیا میں آگے بڑھانے اور ضروریات کا جائزہ لینے کے لئے یہاں آئے ہیں۔

ان کے بعد مجھ سے عربی میں خطاب کی فرمائش کی گئی۔ میں نے شروع میں بتایا کہ بلقان کے ساتھ ہمارے اکابر دیوبند کا کتنا گہرا اور جذباتی تعلق تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے موقع پر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے کس طرح جنگ بلقان کو مدد پہنچانے کی کوشش کی، یہاں تک کہ ہندوستان کی مسلمان خواتین نے اپنے اپنے زیور بلقان کی جنگ میں تعاون کے لئے نچھاور کئے، اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے ہندوستان سے امدادی دستے بلقان روانہ فرمائے جس کے واقعات ہم نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ سے سُنے، اس لئے ہم اپنے بچپن ہی سے بلقان کے نام سے نہ صرف آشنا تھے، بلکہ اس کی محبت دل میں پیوست تھی۔ آج الحمدللہ تعالیٰ ہمیں براہ راست یہاں آنے کا موقع ایسے وقت ملا ہے جب بوسنیا کے مسلمان ایک خونریز جنگ میں فتحیاب ہوکر یہاں اپنی حکومت قائم کرچکے ہیں۔ اس کے بعد میں نے اس بات پر اہل بوسنیا کو مبارکباد دی کہ انہوں نے جنگ میں فتح حاصل کرنے کے بعد یہاں اسلام کے احیاء کا کام شروع کیا ہوا ہے، اور ان کی حکومت قائم ہونے کے بعد یہاں بڑی تعداد میں مسجدیں قائم ہوئی ہیں۔ لیکن چونکہ اس علاقے پر جبر واستبداد کا ایک لمبا عرصہ گذرا ہے، اس لئے نوجوان نسلوں کے دین کی حفاظت اور ان کی دینی تربیت اب بھی ایک بڑا اہم مسئلہ ہے جسے بڑی حکمت، تدبر اور علماء اور دانش وروں کے باہمی اتحاد کے ذریعے ہی حل کیا جاسکتا ہے۔ میں نے یہاں کی مساجد میں دیکھا کہ تقریباً ہر مسجد میں داخلے کی جگہ پر نماز کا مفصل طریقہ، یہاں تک کہ سورۂ فاتحہ وغیرہ بھی عربی کے علاوہ بوسنین رسم الخط میں لکھی ہوئی ہوتی ہے، تاکہ نوجوان اسے دیکھ کر نماز پڑھ سکیں۔ میں نے تجویز پیش کی کہ ہر مسجد میں عام مسلمانوں کی آگاہی کے لئے ایسے دروس کا سلسلہ باقاعدگی کے ساتھ شروع کرنے کی ضرورت ہے جو مسلمانوں کو بنیادی دینی احکام سے روشناس کراسکیں۔ نیز عام مسلمانوں کے لئے بوسنیا کی زبان میں ایسے عام فہم کتابچے تیار کئے جائیں جو مسلمان اپنے گھروں میں پورے خاندان کے ساتھ رات کو سونے سے پہلے پڑھا کریں۔

تقریر کے بعد سوال وجواب کی ایک طویل نشست ہوئی جس میں حاضرین نے عربی یا انگریزی میں مختلف مسائل کے بارے میں سوالات کئے، اور میں نے ان کے مفصل جوابات دینے کی کوشش کی۔ کانفرنس کے بعد سب عشائیہ میں شریک ہوئے، اور اس کے دوران بھی گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ رات گئے اس نشست کا اختتام ہوا۔

اگلا دن جمعہ تھا جو ہماری واپسی کا دن تھا۔ سرائیوو سے قطر ایرلائنز کے ذریعے دوحہ، اور وہاں سے بفضلہٖ تعالیٰ بعافیت کراچی واپسی ہوئی۔

☆☆☆